مثنوی سوز و گداز کا تنقیدی جائزہ

مثنوی فن شاعری کی مشہور و مقبول صنف ہے۔ اپنے صنفی پھیلاؤ اور معنوی وسعت کے لحاظ سے اس کا جواب نہیں۔ شاعری کی دیگر اصناف میں فنی قید و بند کی وجہ سے بیان کی گنجائش محدود ہو جاتی ہے۔ غالبؔ جیسا شاعر بھی تنگنائے غزل سے اکتا کر کہہ اٹھا ؎ کچھ اور چاہئے وسعت میرے بیاں کے لئے

مثنوی میں بیان کی اس وسعت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، فارسی میں مثنوی نے عروج کی غزلیں طئے کیں اور شاہنامہ فردوسی جیسی بے نظر مثنوی معرض وجود میں آئی۔ خمسۂ نظامی اور خمسۂ خسروؔ کی مثنویاں عالمی شہرت کی حامل ہوئیں۔ فارسی سے ہی یہ صنف سخن اردو میں منتقل ہوئی۔ دکن میں خوب پھولی پھلی اور شمال ہند میں آ کر اس رنگینیاں شباب کو پہونچیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مثنوی کے معنی دو دو کے ہیں۔ اس کا ہر شعر ایک دوسرے سے بظاہر جدا ہوتا ہے۔ صرف دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اشعار میں معنوی ربط اور تسلسل اولین شرط ہے۔ دکن میں ضخیم مثنویاں لکھی گئیں۔ ملا وجہیؔ کی ''قطب مشتری''، غواصی کی ''سیف الملوک'' و ''بدیع الجمال''، مقیمؔی کی چندر بدن و ماہیار، نصرتیؔ کی گلشن عشق، ابن نشاطی کی پھول بن وغیرہ۔

ہیئت کے اعتبار سے مثنوی ایک ایسی صنف ہے جسے ہم خالص بیانیہ شاعری کے لئے مخصوص کرتے ہیں۔ اس میں قصے کہانیاں اور داستان نظم ہوتی ہے۔ لہٰذا بیان میں نثر کا تسلسل پایا جانا ضروری ہے۔ واقعہ نگاری کا لطف بھی یہی ہے کہ اس کے بیان میں کوئی رکاوٹ اور پیچ حائل نہ ہو، قصہ کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ آگے کی طرف بڑھتا اور پھیلتا جائے۔

موضوع کے اعتبار سے مثنوی کی کئی قسمیں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً عشقیہ مثنوی، رزمیہ مثنوی، صوفیانہ مثنوی، فلسفیانہ مثنوی، تاریخی، سیاسی اور اخلاقی مثنوی۔ عام طور پر عاشقانہ مثنویوں کو زیادہ قوی عام حاصل رہا کہ یہ انسانی فطرت سے قریب اور ماحول سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

شمالی ہند میں دکن کے بعد مثنویاں لکھی گئیں اور زیادہ تر عشقیہ مثنویاں ہی لکھی گئیں۔ میر تقی میرؔ کی مختصر عشقیہ مثنویاں مشہور ہیں۔ حقیقت یہ کہ جنوبی ہند میں میر حسن دکنوی کی مثنوی سحر البیان اور منشی دیا شنکر نسیم لکھنوی کی مثنوی ''گلزار نسیم'' وہ شاہکار عشقیہ مثنویاں ہیں جن کا جواب نہیں۔ زبان و بیان اور صنائع و بدائع کا وہ کون سا حسن ہے جو ان میں نہیں۔ مگر ان مثنویوں کے علاوہ بھی کچھ کچھ فنکاروں نے ایسے شہ پارے چھوڑے ہیں جو بدقسمتی سے ایک مدت تک گوشہ گمنامی میں پڑے رہے اور ان کی قرار واقعی شہرت نہ ہو سکی۔ ایسی ہی مثنویوں میں صوبہ بہار کے بلند پایہ عالم اور جلیل القدر شاعر علامہ ظہیر احسن شوق نیموی کی ''سوز و گداز'' بھی ہے۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ شمالی ہند کے تین شوق اپنی کامیاب مثنویوں کے لئے کافی مشہور

ہوئے۔

پہلے نواب مرزا شوق لکھنوی جن کی مثنوی ''زہر عشق'' بے پناہ مقبول ہوئی، دوسرے مولوی احمد علی شوق لکھنوی جن کی مثنوی ''عالم خیال'' اپنے منفرد انداز و بیان، طرز و ادا اور چہار رخ کے سبب سرمۂ نظر بنی۔

تیسرے علامہ ظہیر احسن شوقؔ نیموی ہیں جن کی مثنوی ''سوز و گداز'' ایک مشہور عشقیہ داستان کے پرسوز انداز بیان کے لئے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ''سوز و گداز'' میں حسن اور شام سندر کے سچے عشق کی داستان ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ داستان فرضی و خیالی ہے یا واقعتاً کبھی ایسا ہوا ہے کیونکہ میرؔ کی مثنوی شعلۂ عشق میں بھی ایسا تخیلی قصہ ملتا ہے۔

بہر حال یہ واقعہ عشق جو اس مثنوی سوز و گداز کی جان ہے سنی سنائی باتوں یا مصنف کی خیال آرائیوں پر مشتمل ہے۔

اردو میں مختصر مثنویوں سے قطع نظر طول طویل مثنویوں کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند نے اپنی مشہور کتاب ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' کی جلد اول میں رقمطراز ہیں:

> ''قدیم رنگ کی مثنویوں میں کئی رنگ ہوتے ہیں لیکن اس کی سختی کے ساتھ پابندی نہیں کی جاتی، بلکہ شاعر حسب مرضی ان میں ترمیم کر لیتا ہے۔ نظم کی ابتداء احمد، نعت اور منقبت سے ہوتی ہے۔ مذہبی بزرگوں کی مدح و توصیف کے بعد شاعر کے ربی کی مبالغہ آمیز تعریف ہوتی ہے..... بعض شعراء تعریف سخن یا تعریف خامہ یا مناجات عاشقانہ بھی تحریر کر دیتے ہیں لیکن یہ شاذ ہے مدحت طرازی کے بعد سبب تالیف یا وجہ تصنیف کا جزو ہوتا ہے۔ اس سے مصنف اور مثنوی کے ماخذ کے متعلق بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس تمہید کے بعد اصل داستان شروع ہوتی ہے۔ بعض شعراء اس مقام پر ساقی نامہ لکھ دیتے ہیں۔ طویل مثنویوں کو کئی فصلوں یا داستانوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔''

مثنوی ''سوز و گداز'' اپنے پلاٹ، کردار نگاروں، واقعہ طرازی، اسلوب نگارش، زبان و بیان، ربط و تسلسل، داستان، دلچسپی و دل بستگی، تحیّر و تجسس، سادگی و پرکاری و جذبات نگاری اور مقام رسوم کی عکاسی کے ساتھ ہندو مسلم کلچر کی متحدہ روایات کے پیش نظر اپنے شاعرانہ محاسن کے لئے بے مثال ہے۔ مثنوی سوز و گداز بھی روایتی طور پر حمد و نعت و مناجات کے بعد آغاز داستان ہے۔ اس مثنوی میں واقعات بیان، حالات کے تغیر اور واردات کے لئے مختلف عنوانات ہیں جنہیں ہم مثنوی کے ابواب سے تعبیر کر سکتے ہیں، مثلاً جوش وحشت، جذبۂ عشق، نیرنگ گدائی، رامائن سبھا، سامان عروسی، شعلہ افشانی، پیوند مواصلت، حسن معاشرت، واقعہ جانکاہ، شعلہ جاں گداز اور خاتمۂ کتاب تقریباً ساڑھے چھ سو اشعار کی مثنوی ''سوز و گداز'' ۱۳۱۲ھ میں تصنیف ہوئی جیسا کہ مصنف کے تاریخی شعر سے معلوم ہوتا ہے۔

سنو پھر سال تاریخ خداداد
پسند خاطر ہر با صفا باد

۱۳۱۲ھ

اس دلچسپ مثنوی کی تاریخ فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی اور جناب فضاحت لکھنوی جیسے بڑے شاعروں نے بھی لکھی۔اس مثنوی کی کامیابی نیز فنکارانہ خوبیوں کی خوب خوب تعریف کی۔ داغؔ لکھتے ہیں:

مثنوی جس کا نام سوز وگداز — اس سے بہتر نہیں فسانۂ شوقؔ
حضرت شوق کی ہے یہ تصنیف — باعث رونق زمانۂ شوق
معدن طبع میں ہے گوہر عشق — مخزن دل میں ہے خزانۂ شوق

اورفصاحت یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

شیریں جو ہے کلام تو کہتے ہیں اہل ذوق — ایسی تو نظر دیکھی نہ ہم نے سنی کبھی
مضمون استعارے محاورے مثالیں — لطیف زباں کے ساتھ صفائی بھی نظم کی
دیتے سخن کی داد مصنف کو وہ ضرور — ہوتے جو آج حافظؔ و عرفیؔ و انوریؔ

مثنوی سوز وگداز میں جو قصہ بیان ہوا ہے وہ دراصل اس معاشرے کا ایک واقعہ عشق ہے جس میں فوق الفطرت عناصر کی بھی آمیزش ہوگئی ہے۔مثلاً اس مثنوی کی ہیروئن شام سندر مرنے کے بعد ایک ہودج نوریں سوار آسمان سے زمین پر اترتی ہے اور اپنے عاشق صادق حسن کو آواز دیتی ہے ؎

لب آب رواں گنگا کے اس پار — فلک سے ہوتی ہے اک شئے نمودار
اترتی ہے وہ مثل ہودج نور — نہ جانے ہرنی ہے اس میں یا مور
یہی اس کی صدائے پرلحن ہے — کہاں کس رنگ میں تو اے حسن ہے

حسن یہ سن کر گنگا کے کنارے جاتا ہے اور اس آواز پر لبیک کہتا ہوا اس نور کے جھاکے یا شعلے کی لپیٹ میں خود کو گم کر دیتا ہے۔اس غیر معمولی واقعہ کا جواز یوں نکالا گیا ہے، لکھتے ہیں:

''اس دلچسپ مثنوی میں کوئی واقعہ خلاف عقل نہیں۔مگر صرف یہی ایک حیرت انگیز واقعہ ہے جس میں شاید لوگوں کو کلام ہو مگر روح کا کسی توازن شکل میں متشکل ہو کر آناً فاناً مستعبد ہے نہ شرعاً بلکہ جو لوگ مسمر بزم کے عجائب وغرائب سے کچھ خبر رکھتے ہیں وہ بلا تامل اس کی تصدیق کر سکتے ہیں تاہم اگر واقعات پر نظر نہ ہوتی اور متعدد ثبوت کا لحاظ نہ ہوتا تو نئی روشنی والوں کی خاطر سے ہم اس کو فاس فورس کہہ دیتے مگر ہمیں تو یہی کہتے بنتا ہے کہ سب عشق کے نیرنگ تھے۔''

المختصر! مثنوی سوز وگداز حسن اور شام سندر کے سچے عشق کی ایک داستان دردناک خیز ہے۔حسن اس قصے کا ہیرو ہے جو پٹنہ سیٹی کا رہنے والا ہے ؎

عظیم آباد میں اک نوجوان تھا　　حسن ہے نام کام آہ و فغاں ہے
نہال بوستاں عیش و آرام　　گل گلزار استغناں حسن نام

اپنا تعارف وہ یوں دیتا ہے ؎

کہا چھوٹی پٹن دیوی مکان ہے　　حسن ہے نام کام آہ وفغاں

شام سندر اس شہر ایک ہندو تاجر کی بیٹی ہے ؎

پریوش، ماہ سیما مہر طلعت　　بلا قامت، قیامت قہر، آفت

حسن اس کو گنگا میں اسنان کرتے دیکھ کر اس کے حسن پر فریفتہ ہو گیا اور عشق کی یہ آگ دونوں طرف لگ گئی۔ حسن اس سے ملنے کے مواقع پیدا کرتا ہے۔ سادھو کا بھیس بدلتا ہے۔ رامائن کی کتھا کہتا ہے اور شام سندر کے باپ کو متاثر کرتا ہے۔ اس کے گھر مہمان ہوتا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ شام سندر کی شادی طئے ہو جاتی ہے اور عین شادی کی رات منڈپ میں آگ لگتی ہے اور اس بھیانک آتش زنی میں شام سندر کا دولہا جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ اس ہنگامہ دار و گیر میں حسن وہاں پہونچتا ہے اور اپنی جان پر کھیل کر شام سندر کو آگ سے صاف بچا لے جاتا ہے۔ وہاں یہ مشہور ہو جاتا ہے کہ شام سندر بھی دولہا کے ساتھ جل مر گئی۔ جس نے انسانی ہمدردی کا ثبوت دیتے ہوئے شام سندر سے کہا ؎

چلو تم کو ملادوں باپ ماں سے　　کہیں ٹھنڈی نہ ہوں سوز نہاں سے

شام سندر حسن کے عشق بے پناہ کی اسیر ہے وہ اس موقع کو غنیمت سمجھتی ہے اور کہتی ہے کہ لوگ مجھے مردہ سمجھ چکے ہیں۔ اب میں اسلام قبول کرتی ہوں اور تیری شریک حیات بنتی ہوں:

مرے جلنے کا جب سبکو یقین ہے　　تو پھر کچھ خوف رسوائی نہیں ہے

الغرض شام سندر مسلمان ہو گئی اور حسن کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھ گئی۔ دن عیش و مسرت کے گذرنے لگے۔ حسن کچھ لوگوں کے ساتھ گنگا پار چھتر کا میلہ دیکھنے گیا۔ واپسی میں طوفان آیا اور کشتی الٹ گئی۔ سارے لوگ غرقاب ہو گئے۔ حسن کسی طرح بہتا ہوا دور کنارے جا لگا۔

یہاں حسن کی غرقابی اور موت کی خبر گرم ہوئی اور شام سندر رنج و غم اور صدمے کی تاب نہ لا کر راہی ملک عدم ہوئی۔ اس کفن دفن ہو گیا۔ کئی دنوں بعد حسن صحیح سلامت واپس آیا اور محبوبہ کی قبر پر آہ و بکا کرتا رہا۔ اس درمیان یہ خبر مشہور ہوئی کہ گنگا کنارے ایک ہودج نور اترتا ہے اور حسن کو آواز دیتا ہے۔ حسن ایک شب گنگا کنارے پہونچتا ہے اور واقعتاً اس ہودج نور کی سن کر دوڑتا ہوا اس میں گم ہو جاتا ہے۔

علامہ شوق نیموی نے اس مثنوی سوز و گداز میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے اور بڑے سلیقے سے حسن اور شام سندر کا کردار پیش کیا ہے۔ مصنف چونکہ خود ایک ثقہ عالم تھے اور سماج میں ایک معتبر اور معزز مقام کے حامل تھے۔ انہوں نے اس مثنوی میں کہیں بھی عریانیت، رکاکت، سقم اور ابتذل کو راہ نہ دی جو عام طور پر عشقیہ مثنویوں میں پایا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی سوز و گداز کا رتبہ بلند ہے۔ عشقیہ انداز میں رنگینی و شگفتگی ضرور ہے مگر سچے اور پاک جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ واقعات کے بیان میں طوالت کو راہ

نہ دی تا کہ دلچسپی اور تجسس برقرار رہے۔ زبان صاف ستھری، معیاری دلچسپ اور باوقار ہے۔ شعری صنعتوں کا بھی استعمال اس حسن وخوبی سے ہوا ہے کہ زبان بوجھل نہ ہو۔

بحر بھی اس مثنوی کی ہزج مسدس محذوف منتخب کی گئی یعنی مفاعیلن مفاعیلن فعولن جس سے اشعار میں روانی صفائی اور شگفتگی پیدا ہوگئی ہے۔ شاعر کو خود اس کا احساس رہا ہے کہ زبان و بیان کی پاکیزگی بہر طور برقرار رہے۔ لہٰذا مناجات میں لکھتے ہیں:

عطا کر مجھ کو وہ دل یا الٰہی　　جو ہو دم ساز آہِ صبح گاہی
ملا دے آہ سے عرش بریں پر　　کرے رو رو کے تر فرش زمیں کو

الغرض مثنوی سوز و گداز اردو میں لکھی جانے والی عشقیہ مثنویوں میں ایک منفرد اور بلند پایہ شاہکار ہے جسے ہر دور میں خراج عقیدت پیش کیا جاتا رہے گا۔

—ڈاکٹر زرنگار یاسمین

❁❁❁